اقبال کے معاشی افکار اور آج کا پاکستان

ڈاکٹر رفیق احمد

زیر نظر مقالہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ ماہر معاشیات نہ ہونے کے باوجود اقبال کے معاشی خیالات کیوں اہمیت رکھتے ہیں۔ دوسرے حصے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ خیالات بنیادی طور پر کیا تھے۔ تیسرا حصہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے آج سے ساٹھ ستر سال پہلے اپنے معاشی افکار کی روشنی میں جو چند عملی اقتصادی تجاویز پیش کی تھیں ان پر ابھی تک عمل نہیں ہوا حالانکہ وہ آج بھی ہمارے بہت سے دکھوں کا علاج پیش کرتی ہیں۔

واضح رہے کہ یہ ایک مختصر مقالہ ہے جو اس امر کا متحمل نہیں کہ اقبال کے معاشی افکار کا مکمل تجزیہ پیش کرے۔ ایسا تجزیہ اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ مفکر کی ذاتی زندگی اور ذاتی تجربوں کو سامنے رکھ کر بات کی جائے اور اس کے دور حیات کے واقعات' تحریکات اور اس کے اپنے مجموعی خیالات کی روشنی میں اس کے مخصوص فکری میلانات پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ تحریر شاعر مشرق کے معاشی خیالات کا محض ایک اجمالی خاکہ پیش کرتی ہے۔

اہمیت

اگرچہ علامہ اقبال معروف معنوں میں ماہر معاشیات نہیں تھے لیکن ان کے فلسفیانہ اور عمرانی نظریات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے اندر انسان کے معاشی مسئلہ کو ایک موثر منطقی انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے جو خیالات پیش کئے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ معاشی فلاح و بہبود کا مقصد انسان کی ذات اور اس کے حوالے سے اس کی تہذیب و تمدن کی حفاظت اور پرورش ہے۔ اس کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ غربت ہے۔ اقبال کے اپنے الفاظ میں :

> "ذرا خیال کرو غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ

اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔" (علم الاقتصاد۔ دیباچہ۔ صفحہ ۳۰)

ماہرین اقتصادیات بہت مدت تک اپنے علم کی فنی حدود سے باہر نہیں نکلے لیکن اب اس حقیقت کو تسلیم کیا جا رہا ہے کہ معاشی اور تمدنی صحت مندی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صرف طلب اور رسد کے جابرانہ قوانین ہی اہمیت نہیں رکھتے انسانوں کی معاشی پسماندگی کو دور کرنا بھی علم اقتصادیات کی ذمہ داری ہے۔ امریکی معیشت دان جان گیلبرتھ (J.K.Gailbraith) اور اس کے ہم نوا اس نقطۂ نظر کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علم معاشیات کی وہ شاخ جسے ترقیاتی معاشیات کہا جاتا ہے اور جو دوسری جنگ عظیم کے بعد معرض وجود میں آئی' انسانوں کی فلاح و بہبود کو آزاد منڈیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے موزوں حکومتی مداخلت کی حامی ہے تاکہ نوع انسانی کو کم از کم بھوک اور جہالت سے محفوظ رکھ کر تمدنی ارتقا کے تقاضے پورے کئے جا سکیں۔ زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کا مقصد اسی نقطۂ نظر کا غماز ہے۔

ظاہری طور پر اقتصادی ڈھانچہ کتنا ہی خوشنما اور عظیم الشان کیوں نہ ہو اگر وہ مجموعی مفلسی کو دور کر کے ایک پرسکون اور جبر و استبداد سے پاک تمدنی زندگی کی طرف ترقی نہیں کرتا تو معدوم ہو سکتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہر جاندار وجود کی طرح اقتصادی نظام کا وجود بھی دو بنیادی اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک بیرونی جسمانی ڈھانچہ اور دوسرا اس کے اندر بسنے والی تمدنی روح۔ اگر روح بیمار ہو تو بیرونی ڈھانچے کی چمک دمک محض نگاہ کا دھوکہ ہوتی ہے۔

حال ہی میں روس اور مشرقی یورپ کے اقتصادی ڈھانچہ کو جو دھچکا پہنچا ہے وہ اسی حقیقت کا غماز ہے۔ خود پاکستان کی اقتصادی تاریخ بھی یہی گواہی پیش کرتی ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہمارا بیرونی اقتصادی ڈھانچہ بظاہر خوبصورت انداز میں تعمیر ہو رہا تھا۔ نئی نئی صنعتیں اور بنک' تعلیمی اور زرعی اصلاحات' بیرونی امداد اور سرمایہ کاری' قومی عمارات کی تعمیر' یہ اور اس قسم کے اور کئی معاشی پروگرام تیز رفتاری سے عملی جامہ پہن رہے تھے لیکن اندر سے قومی روح بے چین تھی انفرادی اور علاقائی معاشی ناہمواریاں پیدا ہو رہی تھیں' امیری اور غریبی کا تفاوت بڑھ رہا تھا۔ چند خاندانوں نے مالی اور عمومی معاشی پالیسیوں کا رخ اپنے مفادات کی حفاظت اور فروغ کی طرف موڑ رکھا تھا۔ غربت اور بے روزگاری کے مسائل دن بدن پیچیدہ ہو رہے تھے۔ سرمایہ دار' جاگیردار' بیوروکریسی اور فوجی افسر قومی تقدیر کے مالک بنے ہوئے تھے۔ جمہور بے بس تھی۔ نتیجہ کیا نکلا دس سال سے تعمیر ہونے والا خوش نما اقتصادی ڈھانچہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخری

سالوں میں دھڑام سے نیچے آگرا اور اپنے ساتھ مشرقی پاکستان کو بھی دفن کر گیا۔

کچھ اسی قسم کی صورت حال اس وقت بھی ہے۔ پچھلے پانچ سالوں سے ظاہری طور پر جو معاشی ڈھانچہ تعمیر ہو رہا ہے اس کی بنیادیں نج کاری (Privatisation) غیری ضروری سرکاری پابندیوں سے آزادی (De-regulation) اور قومی صنعتوں کی پرائیویٹ ہاتھوں میں فروخت (De-nationalization) پر رکھی گئی ہیں۔ یہ تصور عام ہے کہ منڈیوں کو آزاد کرنے سے معیشت خودبخود ترقی کرے گی۔ زر اور ملکی اور غیر ملکی سرمائے کی آزادانہ نقل و حرکت سے ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ اس سلسلے میں ایسی مالیاتی، تجارتی، صنعتی اور زرعی پالیسیوں پر عملدرآمد بھی شروع ہو چکا ہے جو مختلف معاشی شعبوں کو متحرک کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن کیا محض ان اقدامات سے عامتہ الناس ان معاشی الجھنوں سے آزاد ہو رہے ہیں جن سے ان کی تمدنی شخصیت کے ابھرنے کے امکانات پیدا ہوں۔ کیا غربت، بے روزگاری، مہنگائی اور علاقائی، مقامی اور انفرادی ناہمواریوں کے دردناک نظارے کم ہو رہے ہیں۔ آزاد معیشت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عوام کے تعلیمی، طبی اور رہائشی مسائل موجودہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ تمدن کی موجودگی میں بطریق احسن حل کر دے گی ایک خیال خام معلوم ہوتا ہے۔ اگر بیرونی معاشی ڈھانچہ کی مطلوبہ تعمیر ہو بھی گئی اور بڑے بڑے کارخانے، شاہراہیں اور بجلی گھر معرض وجود میں آ بھی گئے تو تمدنی فروغ کے نقطۂ نظر سے لاحاصل ہوں گے۔ اگر ان کا ثمر مفلسی اور معاش اونچ نیچ کے مکمل خاتمہ کی شکل میں نہ نکلا۔

یہی وہ عوامل ہیں جو معیشت اور عمرانی قوتوں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں اور جن کے حوالے سے اقبال کا معاشی تجزیہ اہمیت رکھتا ہے وہ خود فرماتے ہیں :

> "تمام علوم کا موضوع ذات انسان ہے جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدن کا موضوع ہے۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے۔ یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو۔ اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو پھر اس کا کیا فائدہ؟" (علم الاقتصاد، صفحہ ۵۹)

اقبال کے اس قول سے ہمیں جو بصیرت ملتی ہے وہ یہ کہ مجموعی قومی دولت (GNP) کے فروغ اور تقسیم کے منصوبے اور پالیسیاں بناتے وقت ہمیں انسانی ذات کی تعمیر اور صحت مند تمدنی ارتقا کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور اس سلسلے میں ان کے اپنے الفاظ میں پہلا کام یہ

کرنا چاہئے کہ

"ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو۔ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کیلئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔" (علم الاقتصاد۔ صفحہ ۳۱)

نوعیت

اقبال کے معاشی افکار کی وسیع تر تمدنی اہمیت جاننے کے بعد اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ان افکار کی نوعیت کیا ہے۔ انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وسیع تر تمدنی فروغ کے حوالے سے معاشی عوامل کی اہمیت واضح کی بلکہ ان کی تصنیفات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے علم معاشیات کا مطالعہ کرنے میں خاصی محنت سے کام لیا اور اپنے دور کے معاشی نظریوں پر اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ اپنے تصورات کی روشنی میں ان پر تنقیدی نگاہ ڈال سکیں۔ لگتا ہے کہ انہوں نے فلسفہ خودی کی طرح کوئی مربوط معاشی نظریہ وضع نہیں کیا البتہ اپنی زندگی کے فکری ادوار میں شروع سے آخر تک معاشی مسائل پر نثر اور نظم دونوں میں برابر خیال افروز اظہار رائے کرتے رہے۔ بعض خیالات تو ایسے ہیں جن پر نئے علوم کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے خاص کر اشتراکیت اور اسلامی معاشیات یا فقہ کے حوالے سے جن کا مختصر ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

اقبال کے معاشی افکار ان کی بہت سی تحریروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف علم الاقتصاد کے نام سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ علم اقتصادیات پر یہ غالباً اردو کی پہلی تدریسی کتاب تھی جو اس دور کے مروجہ نظریات کی عکاس تھی۔ اس میں کہیں کہیں انیسویں صدی کے مشہور امریکی ماہر اقتصادیات فرانسس واکر (۱۸۴۰-۹۷ء) اور تھامس مالتھس (۱۷۶۶-۱۸۳۴) کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ البتہ جابجا اقبال نے اپنی جدت فکر کے مظاہرے بھی کئے ہیں۔ مثلاً علم معاشیات کا ایک اہم مفروضہ یہ ہے کہ انسان کی معاشی زندگی خودغرضی سے عبارت ہے اقبال نے اسے خودغرضی اور ایثار دونوں کا امتزاج قرار دیا ہے گویا کہ خالص معاشی عامل کے ساتھ تمدنی عنصر بھی شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی اور قومی صنعتی تعلیم کے معاشی ثمرات بھی کتاب کے اہم موضوعات ہیں جو اس دور کے حوالے سے ساٹھ ستر سال کی فکری پیش رفت ظاہر کرتے ہیں۔

اقبال کی ان نثری تحریروں میں جن میں معاشی معاملات پر رائے زنی کی گئی ہے مندرجہ

ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(الف) قومی زندگی

یہ مضمون اکتوبر ۱۹۰۴ء کے ماہنامہ مخزن لاہور میں شائع ہوا۔

(ب) ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر

یہ لیکچر ۱۹۱۰ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا گیا۔

(ج) ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں مسلمانوں کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ۔

(د) ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۰ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں کی گئیں مختلف تقاریر۔

(س) خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء)

(ش) نومبر ۱۹۳۶ء کے رسالہ الحکیم لاہور میں ضبط تولید پر تحریر اور

(ص) ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ارسال کردہ قائداعظم کے نام خطوط۔

اس کے علاوہ ان کے مکاتیب اور مختلف موقعوں پر دیے گئے بیانات بھی کافی اہم معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

جہاں تک ان کی اردو اور فارسی شاعری کا تعلق ہے ان کی بے شمار نظمیں اور اشعار بالواسطہ اور بلاواسطہ زندگی کے معاشی پہلو کے بارے میں ان کے جذبات و احساسات کی بہت عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔ خضر راہ، لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، اشتراکیت، کارل مارکس کی آواز اور ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ یہ ان کی چند مشہور نظمیں ہیں جن میں ہم عصر معاشی تحریکوں پر بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے اسی طرح اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ میں کئی مقامات پر اقبال نے اپنے معاشی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اقبال کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کی تمام معاشی تحریکوں سے باخبر تھے یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ جدید معاشیات تین فکری تحریکوں سے عبارت جن کو علی الترتیب کلاسیکل، نیوکلاسیکل [illegible] اور جدید امتزاجی نظریات کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اقبال کے دور میں [illegible] تحریکیں [illegible] تھیں۔ وہ ان تینوں تحریکوں کی جزئیات سے آشنا تھے۔ [illegible] معاشی تحریروں اور نظموں پر مفصل تبصرے کیلئے ایک [illegible] لب لباب پیش کرنا مقصود ہے جس کے مندرجہ ذیل اجزاء قابل غور ہیں۔

(الف) اقبال کو جہاں کہیں بھی اور جس اقتصادی نظام میں بھی انسانی ذات کے فروغ کے حوالے سے رکاوٹیں نظر آئی ہیں انھوں نے ان کی مذمت کی ہے اور انھیں دور

کرنے پر زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دل خراش رکاوٹ مفلسی پیدا کرتی ہے اور ان کے خیال میں اس کی ذمہ داری اس نظام پر ہے جس پر جاگیردار، سرمایہ دار اور استحصال پسند طبقہ چھایا ہوا ہے۔ یہ طبقہ مختلف شکلوں اور رنگوں میں حتیٰ کہ حکومتی، مذہبی اور فرقہ وارانہ تنظیموں کی صورت میں بھی کارفرما ہے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
(لینن خدا کے حضور میں)

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی!
(فرشتوں کا گیت)

(ب) اشتراکیت کے بارے میں بھی اقبال نے اسی نقطۂ نگاہ سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک سرمایہ داری کے خلاف اشتراکیت کی دشمنی کا تعلق ہے اقبال اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور غریب طبقوں سے روا رکھی جانے والی بے انصافیوں اور سرمایہ داروں کی حیلہ گریوں کو وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب اشتراکی طرز حکومت جبر و استبداد اور انسانی ذات کی نفی پر اتر آئی تو اقبال نے اس کی بلا روک ٹوک مذمت کی :

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
(بال جبریل)

لیکن اس کے باوجود اشتراکیت کے وہ عناصر جو انسان کو مفلسی سے نجات دلاتے ہیں اقبال کی نظر میں قابل تقلید ہیں بشرطیکہ وہ انسانی ذات کو فروغ دینے والے اس دائرے میں آ جائیں جو اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ میرے خیال میں یہی مطلب ہے اقبال کے مندرجہ ذیل مشہور فارمولے کا :

بالشوزم + خدا = اسلام

لیکن یہ ایک عمومی فارمولا ہے۔ اس کی تفصیلات طے کرنا ابھی باقی ہیں۔ اشتراکیت کا

نظام روس اور مشرقی یورپ میں پوری تفصیلات کے ساتھ نافذ کیا گیا اور مرکزی منصوبہ بندی کے تحت بہت سے اقدامات کئے گئے۔ ان میں سے کون سے اقدامات اور پالیسیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق تھیں اور کون سی مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ ان پر کوئی قابل ذکر تحقیق نہیں کی گئی۔ مجموعی طور پر اقبال کے ہاں ہمیں جو تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اشتراکیت ایک مکمل نظام فکر کی حیثیت سے قابل قبول نہیں البتہ اس کے بعض بنیادی تصورات سے وہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

(ج) اقبال کے نزدیک جدید نظام سرمایہ داری یا کیپٹل ازم بھی اپنی اندرونی اور بیرونی استحصالی کارروائیوں کی وجہ سے قابل مذمت ہے خاص کر اس لئے کہ اس نے اقوام عالم کو اپنے نوآبادیاتی اور استعماری پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ نظام پردہ تہذیب میں غارت گری اور آدم کشی کا مجرم ہے۔ البتہ اقبال سرمایہ کی زبردست معاشی افادیت کے منکر نہیں۔ سرمایہ ایک نہایت اہم عامل پیدائش ہے اور اس میں روز افزوں اضافہ انفرادی اور مجموعی ترقی کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کیپٹل ازم کا نظام اپنی مکمل شکل میں ایک انسان دوست تمدن کے فروغ کا باعث نہیں اور اکثر و بیشتر خود اپنے معاشروں میں بھی مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں اس نظام کے ہاتھوں جو عالمی بحران پیدا ہوا اور خود مغربی اقوام کی جو درگت بنی اس کا حوالہ لینن کی زبان میں ان اشعار میں ہے :

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
(لینن خدا کے حضور میں)

اس میں شک نہیں کہ پچھلے بیس سالوں میں امریکہ، یورپ اور مشرقی ایشیا بالخصوص جاپان میں نئے انداز کا ایک زبردست صنعتی اور فنی انقلاب برپا ہوا ہے لیکن ابھی تک دنیا کی دو تہائی آبادی غربت و افلاس کی پستیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یو این ڈی پی کی (Human Development Report 1994) کے مطابق عالمی دولت اور جی این پی کے ۸۵ فیصد حصہ پر چند مغربی اقوام قابض ہیں اور امیر اور غریب اقوام کا اقتصادی تفاوت رو بہ اضافہ ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری مکمل

طور پر سرمایہ دارانہ نظام پر ہے۔

(و) انسانوں کے معاشی اور تمدنی مسائل کا تسلی بخش حل اقبال کے نزدیک اسلامی فقہ کی تدوین نو میں ہے۔ فرماتے ہیں "خوش قسمتی سے (معاشی مسائل) کا حل اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید نظریات کی روشنی میں اس کے مزید فروغ میں موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کا بنیادی معاشی ضروریات حاصل کرنے کا حق محفوظ ہو جاتا ہے۔" (قائداعظم کے نام خط مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء) یہ وہی حق ہے جسے آجکل بنیادی ضروریات (Basic Needs) کا حق کہتے ہیں۔

اس قسم کے حق کو محفوظ کرنے کے لئے اقبال نے سوشل ڈیماکریسی یعنی اشتراکی یا معاشری جمہوریت کے نظام کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :

"اسلام کیلئے اشتراکی یا معاشری جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں کے ساتھ اور اسلام کے قانونی اصولوں کے مطابق اختیار کر لینا کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع ہو گا۔" (مذکورہ بالا خط)

واضح رہے کہ ان خیالات کا اظہار اقبال نے اپنی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے قائداعظم کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ یہ ان کے عمر بھر کے وسیع مطالعہ کا ماحصل تھا۔ زندگی نے اقبال کو اس امر کی مہلت نہ دی کہ وہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو کا کام اسی پر بصیرت انداز میں سرانجام دیں جس طرح اس سے پیشتر وہ الہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کے سلسلہ میں کر چکے تھے۔ آج کل اسلامی معیشت کے موضوع کا بہت چرچا ہے اور دنیا بھر میں اس پر ۲ ہزار سے زائد تحقیقی کتب اور مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک لحاظ سے اقبال معاشیات کی ایک نئی شاخ کے بانی ہیں۔ اگرچہ یہ امر محتاج تحقیق ہے کہ اسلامی معیشت کے تحت جن خیالات کو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اگر زندہ ہوتے تو اپنی اجتہادی بصیرت کی روشنی میں ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے۔

(ر) اسلامی تعلیمات میں جو مقام اجتہاد کو حاصل ہے اقبال نے اس پر بہت زور دیا ہے خاص کر شریعت اسلامی کے تمدنی اور معاشی پہلوؤں کے حوالے سے۔ ان کی یہ پرمغز تحریر اسلامی معیشت کے ماہرین کیلئے قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں : "فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے ایک نظرثانی کے محتاج ہیں۔ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بناء پر جو استدلال فقہا نے

وقتاً" فوقتاً" کئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ اگرچہ شیعہ مفسروں نے بعض اصولوں کی تشریح میں ایک حیرت انگیز وسعت نظر سے کام لیا ہے تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعت اسلامی کی جو توضیح جناب ابوحنیفہ نے کی ہے ویسی کسی مفسر نے آج تک نہیں کی۔ قانون اسلامی کی جدید تفسیر کیلئے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ اور متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بناء پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے۔" (قومی زندگی' صفحہ ۴۲) ظاہر ہے کہ اقبال کی یہ خواہش ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

(س) غربت و افلاس کو دور کرنے اور معاشی خوشحالی کو عامتہ الناس کی تقدیر بنانے کیلئے اقبال نے اپنی تحریروں میں جن عوامل پر خاص طور پر زور دیا ہے ان پر آج کل عام بحث ہو رہی ہے لیکن ان کے زمانے میں لوگ ان عوامل سے زیادہ باخبر نہ تھے۔ اس سلسلے میں چھ عوامل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول : نوجوانوں کو صنعتی' فنی اور تجارتی تعلیم سے آراستہ کرنا تاکہ وہ محدود سرکاری ملازمتوں کے لئے سرگرداں ہونے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ دوئم : عورتوں کی تعلیم اور تمدنی ترقی کیلئے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔ خاص کر دیہاتی عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے۔ اس کے علاوہ حقوق نسواں کی اشاعت اور حفاظت کیلئے موزوں تدابیر پر عمل کرنا اس لئے کہ مرد صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے لیکن عورت پورے خاندان پر اثرانداز ہوتی ہے۔ سوئم : بااستطاعت لوگوں پر زور کہ وہ غریب شہری اور دیہاتی علاقوں میں نجی انجمنیں قائم کر کے لوگوں کے مسائل حل کریں۔ یہ وہی ادارے ہیں جنہیں آج کل NGOs کہتے ہیں۔ چہارم : صنعتی ترقی کیلئے بھرپور کوشش کرنا۔ اقبال نے اس سلسلے میں جاپان کی تیز رفتار ترقی کو سراہتے ہوئے اس کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔ ان کا فرمانا ہے کہ "جاپان کا مہذب اقوام میں شمار ہونا اس لئے نہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے فلسفی یا شاعر یا ادیب پیدا کئے ہیں بلکہ جاپانی عظمت کا دارومدار جاپانی صنعت پر ہے۔" (قومی زندگی)۔ پنجم : نشہ آور اشیاء اور مشروبات کی درآمدات کو روکنا کیونکہ یہ انسان کی

ذات کو فنا کر دیتے ہیں۔ ششم : ان تاریخی روایات' عادات' اوہام اور اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنا جو ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں اور ان عوامل کی نشاندہی جو اقتصادی قوت پیدا کرتے ہیں۔ یہ وہی عوامل ہیں جنہیں مشہور امریکی خاتون معیشت دان ارما ایڈل مین نے اپنے ترقیاتی ماڈل میں انگریزی حرف یو میں شامل کیا ہے۔

(ش) اقبال نے مختلف تحریروں میں ہندوستان کی عمومی معاشی پسماندگی کا بھی تجزیہ کیا ہے اور اس سلسلے میں مندرجہ ذیل بڑی بڑی وجوہات کی نشاندہی کی ہے۔ تعلیمی پسماندگی' صنعت سے بے توجہی' تجارت پر مغربی سوداگروں کا قبضہ' افزائش آبادی اور سکہ کی ناموافق شرح تبادلہ جس کی وجہ سے بیرونی منڈیوں سے ہندوستانی خام مال کی کم قیمت وصول ہوتی ہے اور اس کے برعکس انگلستان سے درآمد کردہ صنعتی اشیاء ہندوستان میں مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔

(ص) اقبال کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ایشیا کے مسلم ممالک آزادی سے ہم کنار ہونے والے ہیں لہٰذا انہوں نے متعدد مقامات پر ان ممالک کے مابین باہمی تجارتی روابط کے فوائد کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کو وسطی ایشیا کی جدید ابھرتی ہوئی تنظیم تعاون برائے ترقی کا ایک پیش رو مفکر سمجھنا چاہئے۔

(ض) ملکیت زمین کے بارے میں اقبال کا یہ نظریہ تھا کہ نہ تو حکومت اس کی قطعی مالک ہے اور نہ افراد۔ زمین صرف خداوند کریم کی ملکیت ہے اور حکومت وقت اجتماعی مفاد کیلئے اس کی امین اور منتظم ہے۔ حکومت زمین کے بارے میں صرف انتظامی اقدامات کر سکتی ہے اور کاشتکاری کیلئے فعال مزارعین یا کسانوں کو دے سکتی ہے۔ اگر اقبال کے اس نظریہ پر عمل کیا جائے تو جاگیرداری اور زمینداری نظام ختم ہو جاتا ہے اور فی الواقعہ کاشت کرنے والے عام کسانوں کی معاشی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔

عملی اقتصادی تجاویز

اقبال نے معاشی زندگی کے بارے میں محض فلسفیانہ خیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ انہیں جب بھی موقع ملا اپنے خیالات سے مطابقت رکھنے والی عملی تجاویز بھی پیش کیں۔ یہ مواقع انہیں خاص طور پر پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب ہونے پر ملے۔ ان کی رکنیت کا زمانہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے وقتاً" فوقتاً" جو تقاریر کیں اور صوبائی میزانیوں پر تنقید کے دوران جو عملی تجاویز پیش کیں وہ انتہائی دوررس نتائج کی حامل تھیں۔ ان تجاویز کا

مقصد معیشت کے عادلانہ فروغ کیلئے ایک ایسا بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure) مہیا کرنا تھا جس سے غربت، جہالت اور بے روزگاری دور کرنے میں بہت مدد ملتی اور حکومت کی پالیسیوں کا رخ دیہات اور شہروں میں بسنے والے مفلس لوگوں کی فلاح و بہبود کی طرف مڑ جاتا۔ اس کے علاوہ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کے استحصال کی مختلف شکلوں کے خاتمہ کا امکان بھی پیدا ہو جاتا۔ یہ تجاویز اپنے زمانے سے کئی دہایاں آگے تھیں۔ اسی لئے ہم عصر جاگیردارانہ نو آبادیاتی حکومت کیلئے ناقابل قبول تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی تجاویز آج بھی معاشی اور سماجی ترقی کیلئے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور ان کی بناء پر کئی اصلاحات نافذ کی جا سکتی ہیں۔ یہاں اقبال کی چیدہ چیدہ تجاویز کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ملک کی آبادی کا غالب حصہ دیہات میں بستا ہے لیکن یہ صدیوں سے زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم چلا آ رہا ہے لہٰذا اقبال کی نظر میں کم از کم سرکاری زمینوں کے استعمال کا حق صرف غریب اور بے زمین کسانوں کو ملنا چاہئے۔ تمام قابل کاشت سرکاری زمین مفلس کاشتکاروں میں بانٹ دینی چاہئے اور انہیں کاشتکاری کے سلسلے میں تمام مطلوبہ سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں۔ جب حکومت نے ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے نیلی بار کے علاقہ میں تین لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کی تو اقبال نے اس کی سخت مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ نصف رقبہ مزارعین کو آسان شرائط پر دیا جائے۔ بدقسمتی سے اس اصول پر ابھی تک معمولی حد تک عمل ہوا ہے۔

۲۔ اقبال کے نزدیک زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے (الارض للہ)۔ اسلامی شریعت کے اس اصول کی روشنی میں زرعی زمین صرف ان زمینداروں کے پاس رہنی چاہئے جو اس کی کاشت کر سکیں۔ فقہ اسلامی میں تو کاشت کرنے کی مہلت تین سال تک ملتی ہے۔ اس عرصہ میں اگر کوئی زمیندار زمین کاشت نہ کرے تو حکومت یہ زمین اس سے لے کر کسی دوسرے کاشتکار کو دے سکتی ہے۔ ملکیت اور کاشتکاری کا یہ انقلابی اصول ہر قسم کی جاگیرداری اور وڈیرہ ازم پر ضرب کاری لگاتا ہے اور اس کا معاشی فائدہ یہ ہے کہ تمام قابل کاشت زمینیں زیر کاشت آ جاتی ہیں بشرطیکہ مطلوبہ سہولتیں دستیاب ہوں۔ اس کا لازمی نتیجہ زرعی پیداوار میں اضافہ کی شکل میں نکلتا ہے۔

۳۔ اقبال کے خیال میں دیہات کا ماحول صاف ستھرا بنانے کیلئے حکومت اور نجی انجمنوں کو بھرپور پروگرام بنانے چاہئیں۔ صاحب استطاعت لوگ انجمنیں بنائیں۔ نوجوانوں کی

تنظیمیں دیہات میں جا کر بہتر زندگی گذارنے کا شعور پیدا کریں۔ یہ آج کے ماحولیاتی نقطۂ نظر کے عین مطابق ہے۔

۴۔ دیہات میں طبی سہولتوں کا شدید فقدان ہے۔ خاص کر عورتوں کی ضروریات کے حوالے سے۔ اس سلسلے میں اقبال نے ایلوپیتھی کے ساتھ ساتھ مشرقی طب کے احیاء پر خاص زور دیا ہے اور ملک کے اندر ہی موزوں دوائیوں کی تیاری اور تحقیق کیلئے ادارے قائم کرنے کی ضرورت اجاگر کی ہے۔ اقبال کے نزدیک یونانی اور آیورویدک کی دوائیاں ہمارے علاقے کی بیماریوں کے سدباب کیلئے زیادہ موزوں ہیں اور ارزاں ہونے کی وجہ سے مفلس لوگ انہیں با آسانی خرید بھی سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں تحقیقاتی لیبارٹریاں قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ان کی ۲۲ فروری ۱۹۲۸ء کی تقریر انہی خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔

۵۔ اقبال کی تجاویز میں جابجا عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ اقبال کے خیال میں مرد کی مصروفیات زیادہ تر اپنی ذات تک محدود ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عورت سارے خاندان کے لئے فکرمند ہوتی ہے لہٰذا عورتوں کی حالت سنوارنے سے خاندانوں اور معاشروں پر وسیع پیمانے پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اقبال نے حکومت وقت پر بار بار زور دیا کہ عورتوں کو طبی، تعلیمی اور دیگر سہولتیں ترجیحی بنیادوں پر مہیا کی جائیں اور اس مقصد کیلئے بجٹ میں وافر مقدار میں رقومات مختص کی جائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج بھی ہماری خواتین بہت پسماندہ اور بے بس ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاملے میں پچھلے دس سالوں میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے صورت حال اقبال کے دور سے زیادہ مختلف نہیں۔

مرکزی حکومت نے عورتوں کے مسائل کے حوالے سے ایک محکمہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد نجی انجمنیں اور ادارے بھی مفید کام کر رہے ہیں لیکن یہ کوششیں ناکافی ہیں۔ پاکستان کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے لیکن انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ میں انہیں بہت کم نمائندگی حاصل ہے۔ سماجی معاملات میں بھی عورتوں کی بے بسی اور استحصال کے واقعات عام ہیں۔ عورتوں کے معاملہ میں اقبال کی پرزور تحریروں کی روشنی میں بیداری پیدا کرنے والے اور فلاح و بہبود میں اضافہ کرنے والے بھرپور پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلیم کے بارے میں اقبال کے خیالات انتہائی جدید ہیں۔ ان کی رائے میں نوجوانوں

کو عام تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی، صنعتی اور انتظامی علوم سے آراستہ کرنا چاہئے۔ اور انہیں ان ممالک کی اقتصادی اور فنی کاوشوں سے آگاہ کرنا چاہئے جو ترقی و تعمیر کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت کی خاص ذمہ داری ہے کہ وہ بجٹ میں ایسے ادارے کثرت سے قائم کرے جو نوجوانوں کو ہنرمند بنائیں اور سرکاری ملازمتوں کے پیچھے بھاگنے کی بجائے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ترغیب دیں۔

جہاں تک عامتہ الناس کی تعلیم کا تعلق ہے اقبال نے حکومت وقت پر متعدد بار زور دیا کہ جبری تعلیم کا قانون نافذ کرے اور اس سلسلے میں موثر اور قابل عمل حکمت عملی وضع کرے۔ جو لوگ اس قانون پر عمل نہ کریں ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔

اقبال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۵ مارچ ۱۹۲۷ء اور ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو سالانہ میزانیوں پر اظہار رائے کرتے ہوئے تعلیم کے بارے میں حکومت کی عمومی بے حسی کی سخت مذمت کی اور اعداد و شمار سے ثابت کیا جائے کہ تعلیم کے میدان میں کوئی ترقی نہیں ہو رہی۔ اساتذہ کی تعداد ضرورت سے کم ہے۔ طلبہ کی اکثریت ابتدائی سالوں میں پڑھائی چھوڑ دیتی ہے اور بہت کم طلبہ سیکنڈری، پروفیشنل اور ویکشنل درجوں تک پہنچتے ہیں۔ اقبال نے حکومت پر زور دیا کہ وہ انتظامی اخراجات کم کر کے عمومی اور پروفیشنل تعلیم کیلئے زیادہ رقومات فراہم کرے۔ اقبال کے دور میں متحدہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اسلامی مدرسوں کو سرکاری گرانٹ کا صرف ایک چوتھائی حصہ ملتا تھا۔ اقبال نے متعدد بار اس امتیازی سلوک کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور پس ماندہ علاقوں کے تعلیمی اور سماجی فروغ پر زور دیا۔

۷۔ زرعی آمدنی پر انکم ٹیکس لگانے کا مسئلہ ابھی تک اٹکا ہوا ہے۔ اقبال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ۵ مارچ ۱۹۲۷ء اور ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو اپنی تقاریر میں مالیہ کو انکم ٹیکس کی طرح وصول کرنے پر زور دیا۔ ان کے خیال میں مالیہ کا مروجہ طریقہ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ہر زمیندار کو مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے چاہے وہ بڑی زمین کا مالک ہو یا چھوٹی زمین کا۔ اس کے برعکس انکم ٹیکس ہر شخص ادا نہیں کرتا۔ اس کی زد صرف ان لوگوں پر پڑتی ہے جن کی آمدنی ایک خاص سطح سے زیادہ ہو۔ کاشتکاری بھی آمدنی کا ذریعہ ہے اس لئے مالیہ کا انتظام انکم ٹیکس کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔ اقبال نے تجویز پیش کی کہ پانچ بیگھے تک زمین کے مالکوں سے مالیہ وصول نہ کیا جائے۔ اس طرح غریب کسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مالیہ کے بوجھ سے محفوظ ہو جائے گی اور صرف استطاعت رکھنے والے زمیندار ہی اسے ادا کریں گے۔

کسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مالیہ کے بوجھ سے محفوظ ہو جائے گی اور صرف استطاعت رکھنے والے زمیندار ہی اسے ادا کریں گے۔

اقبال کی تجویز پر حکومت کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا کہ کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو مالیہ سے مستثنیٰ کرنے سے حکومت کی آمدنی کم ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں اقبال نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت نظم و نسق کے اخراجات میں کمی کرے اور زراعت پر انکم ٹیکس تدریجی اصول کے مطابق لگائے۔ یعنی زیادہ آمدنی حاصل کرنے والے زمینداروں پر انکم ٹیکس کی شرح زیادہ ہونی چاہیے۔

زراعت پر انکم ٹیکس لگانے کے سلسلے میں اقبال کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سرکاری مالیات کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ حیرت ہے کہ پاکستان نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ٹھوس پیش رفت نہیں کی حالانکہ جدید ماہرین اقتصادیات عمومی طور پر ہر معاشی شعبے پر انکم ٹیکس لگانے کے حامی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال کی یہ تجویز کہ پانچ بیگھے تک کے مالکان زمین کو مستثنیٰ کیا جائے نظر ثانی کی محتاج ہو لیکن جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ انکم ٹیکس کے بارے میں اقبال کے خیالات نہ صرف جدید اصول معاشیات کے مطابق ہیں بلکہ ان سے غریب کسانوں کا فائدہ مقصود ہے جو ملک کی آبادی میں اکثریت رکھتے ہیں اور انسان کی حیثیت سے جن کی ذات کا فروغ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ معاشی طور پر خوش حال بھی ہوں اور تمدنی طور پر آزاد بھی۔

۸۔ محصولات کے نظام کے حوالے سے اقبال کی ایک اہم تجویز یہ تھی کہ موت یا وراثت ٹیکس عائد کیا جائے جسے جدید اقتصادی ادب میں اصطلاح Inheritance Tax کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ کہنا تھا کہ اگر کوئی شخص بیس ہزار یا تیس ہزار روپے سے زیادہ کی مالیت کی جائیداد وراثت میں حاصل کرے تو اس پر ایک خاص شرح سے ٹیکس عائد کیا جائے۔ اقبال کے دور کے بیس ہزار آج کل کے بیس لاکھ سے کیا کم ہوں گے۔

دنیا کے اکثر و بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں وراثت ٹیکس عائد ہے اور اس کا جواز یہ ہے کہ متوفی اپنی جائیداد قومی تحفظ کے ماحول کے اندر رہ کر ہی بناتا ہے لیکن اس کے چھوڑے ہوئے مال و متاع میں قوم بھی حق دار ہے۔ خاص کر اس لئے بھی کہ یہ مال و متاع ورثا کی اپنی کمائی کا حصہ نہیں ہوتا۔ یہ ٹیکس عام طور پر زیادہ مالیت کی جائیداد پر لگایا جاتا ہے لہٰذا یہ دولت کے بہت زیادہ ارتکاز کو روکتا ہے۔ پاکستان میں بھی یہ ٹیکس

عائد تھا لیکن ایک دہائی قبل امراء کے اصرار پر اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ پاکستان میں ارتکاز دولت کا عمل زور شور سے جاری ہے۔ آج کل کے حالات متقاضی ہیں کہ وراثت ٹیکس کا پھر اجراء کیا جائے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں یہ ٹیکس ساٹھ ہزار ڈالر سے زائد مالیت والی وراثت پر لگایا جاتا ہے اور متوفی کی ہدایات کی روشنی میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جائیداد کی باقی مالیت پر تدریجی شرح سے وصول کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وراثت کی قابل محصول مالیت کے پہلے پانچ ہزار ڈالر پر ۳ فیصد' ایک سے اڑھائی لاکھ ڈالر کی مالیت پر ۳۰ فیصد' ۲۰ سے ۲۵ لاکھ ڈالر کی مالیت پر ۶۹ فیصد اور ایک کروڑ ڈالر سے زائد مالیت پر ۷۷ فیصد کے حساب سے وراثت ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے علاوہ اور بہت سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی وراثت ٹیکس لگایا جاتا ہے اگرچہ اس کی وصولی کے پیمانے اور شرحیں مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔

۹۔ اقبال نے اپنی تحریر و تقریر میں صنعتی ترقی کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ خاص کر اس لئے کہ صنعتوں کے فروغ سے بے روزگاری میں کمی واقع ہوتی ہے اور غربت کی لعنت کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں زراعت سے تعلق رکھنے والی صنعتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ حکومت اس معاملے میں قطعاً کوئی توجہ نہیں دے رہی۔

۱۰۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں اقبال کی آخری تقریر غالباً وہ تھی جو انہوں نے ۷ مارچ ۱۹۳۰ء کو ۳۱-۱۹۳۰ء کے بجٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے حکومت کے انتظامی اخراجات کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا اور یہ ثابت کیا کہ حکومت پنجاب کا بجٹ مسلسل خسارے کا اس لئے شکار ہے کہ افسر شاہی کے اخراجات بڑھ گئے ہیں اور مروجہ نظام لوگوں کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے بالکل ناکام ہو گیا ہے۔ اس نظام نے جو گوناگوں مسائل پیدا کئے ہیں ان میں سرفہرست پانچ لعنتیں ہیں۔ بے روزگاری' بھوک اور ننگ' فرقہ وارانہ جھگڑے' مقروض لوگوں کی تعداد میں اضافہ اور خسارے پر مبنی میزانئے۔ اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہئے اور اگر فی الحال یہ ناممکن ہو تو اس پر اٹھنے والے اخراجات کم کر دینے چاہئیں کیونکہ یہ نظام نہ علوم و فنون میں اضافہ کا باعث ہے اور نہ ہی ملک کو صنعتی ترقی کی طرف لے جا رہا ہے۔

حکومتی مشینری معاشرہ پر سراسر بوجھ ہے بہتر ہے کہ اس کو برقرار رکھنے پر کم سے کم خرچ کیا جائے۔ اقبال کی اس اہم تقریر میں چند سرکاری اراکین نے کئی بار مداخلت کی مگر انہوں نے اپنے مافی الضمیر کا کھل کر اظہار کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبال کا یہ تبصرہ آج کل کے حالات پر بھی صادق آتا ہے۔ ہمارے میزانیوں کے بڑھتے ہوئے خسارے اور اس کے باوجود معاشی اور سماجی مسائل میں ہوش ربا اضافہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مروجہ نظام اقتدار نقائص سے لبریز ہے اور اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس کی شناخت بھی بدلی جائے اور اسے چلانے والوں کے کردار و افکار کو اقبال کے انسان دوست فکری سانچوں میں ڈھالا جائے۔

علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام اپنے مشہور خطوط میں مسلمانوں کے معاشی حالات سدھارنے کیلئے جو بار بار زور دیا تھا شاید اس کا اثر تھا کہ ان کی وفات کے چھ سال بعد قائداعظم نے ماہرین پر مشتمل ایک منصوبہ بندی کمیٹی بنائی اور ان کو مندرجہ ذیل راہ نما اصول دیا۔

> ''آپ معاشی مسائل کا جو بھی حل پیش کریں ان میں یہ بنیادی نکتہ پیش نظر رکھیں۔ ہمارا مقصد امیروں کو امیر تر بنانا نہیں ہے اور نہ چند اشخاص کے ہاتھوں میں دولت کو مرتکز ہونے کے عمل کو تیز کرنا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ عام لوگوں کے معیار حیات کو ہموار کریں۔ مجھے امید ہے کہ کمیٹی اس اہم نکتہ پر پوری توجہ دے گی۔ ہمارا نصب العین سرمایہ دارانہ نظام نہیں بلکہ اسلام ہے اور لوگوں کے مفادات اور فلاح کو مجموعی حیثیت سے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔''
>
> (پاکستان بینکر' جنوری۔ جون ۱۹۹۳ء)

مندرجہ بالا اقتصادی منصوبہ بندی کمیٹی ۳ اگست ۱۹۴۴ء کو بنائی گئی تھی اور تیئس افراد پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی نے ایک بیس سالہ اقتصادی پروگرام مرتب کر کے ۲ جولائی ۱۹۴۵ء کو قائداعظم کے حوالے کر دیا تھا۔ پروگرام کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی نے افلاس' بے روزگاری' جہالت اور معاشی پسماندگی سے نجات حاصل کرنے کیلئے دوررس تجاویز پیش کی تھیں اور بہت حد تک یہ انہی خیالات کی عکاس تھیں جو قائداعظم نے متذکرہ صدر خطاب میں پیش کئے تھے۔ تفصیلات میں جائے بغیر یہ بات بالکل واضح ہے کہ خود قائداعظم پر اقبال کے خیالات کی گہری چھاپ

تھی۔ قائداعظم نے خطوط کے پیش لفظ میں اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔

حاصل کلام

اقبال کے معاشی افکار اور تجاویز کا جو سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے معاشی مباحث سے پوری طرح باخبر تھے البتہ انہیں علم معاشیات کی فنی باریکیوں سے زیادہ سروکار نہ تھا۔ ان کے فلسفیانہ اور مذہبی خیالات کا محور انسان کی ذات تھی جس کی حفاظت اور نشوونما پورے معاشرے کی ذمہ داری تھی۔ ان کی عظیم الشان فکری تخلیق ان کا نظریہ خودی تھا لیکن خودی کے فروغ و فراغ کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ مفلسی تھی۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کے خواہاں تھے جو غربت و جہالت سے پاک ہو اور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو۔

کس نہ باشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبین ایں است و بس

اس مقصد کے حصول کیلئے علم معاشیات کا مطالعہ ضروری تھا تاکہ ان عوامل کا پتہ لگایا جا سکے جو قوموں کو معاشی خوش حالی سے ہم کنار کرتے ہیں۔ اقبال نے علم معاشیات سے یہی کام لیا اور اس علم کے طرز استدلال کی مدد سے اپنے وسیع تر تمدنی اور تہذیبی دائرہ فکر کیلئے معاشی بنیادیں فراہم کیں۔ یا یوں کہئے کہ انسان کی معاشی زندگی کو اس کی تمدنی زندگی کے تناظر میں دیکھا۔ علم معاشیات کے مباحث کو سمجھنے کا یہ ایک نیا انداز فکر ہے جو ہمیں اقبال کے ہاں ملتا ہے۔

جدید علم معاشیات میں اس تمدنی انداز فکر کی گنجائش موجود ہے۔ درحقیقت معاشیات ایک ایسا متحرک عمرانی علم ہے جو پچھلی دو صدیوں سے انسانی معاشرے کے بدلتے ہوئے معاشی اور سائنسی ماحول کے حوالے سے نئے نئے نظریات وضع کرتا رہا ہے اور اس حوالے سے اس نے دوسرے علوم سے استفادہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ لیکن معاشی نظریات کو غیر تغیرپذیر عقائد کا درجہ حاصل نہیں۔ مشہور بزرگ ماہر اقتصادیات الفرڈ مارشل کہتے ہیں :

"معاشی نظریہ ایسے طے شدہ نتیجے پر مشتمل نہیں ہوتا جسے فوری طور پر عملی تدابیر کے سانچہ میں ڈھالا جا سکے۔ اسے عقیدے کا درجہ دینے کی بجائے ایک طرز استدلال سمجھنا چاہئے یعنی ذہن کا ایک ایسا آلہ کار یا سوچ بچار کا ایک ایسی فنی عمل جو اپنے عامل کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے" (حوالہ ۱۹)۔ اقبال نے طرز استدلال تو معاشیات کا استعمال کیا ہے لیکن

نتائج تمدنی نوعیت کے اخذ کئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے اسلام کے زمانہ عروج کے ماہرین عمرانیات و اخلاقیات سے بھی استفادہ کیا ہے جو معاشی نظریات و مسائل کو علم سیاست مدن کا حصہ سمجھتے تھے۔ اقبال نے اپنی تصنیف علم الاقتصاد کے عنوان کے نیچے قوسین میں یہ الفاظ درج کئے ہیں۔ وہ علم "جس کا معروف نام علم سیاست مدن ہے۔" یہ معروف نام مسلمان ماہرین عمرانیات کا ایجاد کردہ ہے۔ راقم الحروف نے اقبال کی یہ کتاب پہلے پہل دیال سنگھ کالج لائبریری میں ۱۹۵۰ء کے اوائل میں دیکھی تھی اور قوسین کی عبارت سے متاثر ہو کر عربوں کی اقتصادی تصانیف پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو پاکستان اکنامک جرنل کی اپریل ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں چھپا تھا (حوالہ ۲۰)۔ اس میں باقی باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تیرہویں صدی عیسوی کے نامور محقق محمد بن حسن طوسی کی کتاب اخلاق ناصری میں ایک پورا باب علم سیاست مدن پر ہے جو انسان کی معاشی زندگی پر تمدنی نقطۂ نظر سے بحث کرتا ہے۔ بعد کے مسلمان مصنفین نے بشمول ابن خلدون سیاست مدن پر طویل بحثیں کی ہیں اور اس کے معاشی مضامین کو اخلاقیات کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ البتہ اقبال کے ہاں تمدنی نقطۂ نظر ایک مکمل فلسفہ کی شکل میں اجاگر ہوا ہے اور انہوں نے معاشیات سے تمدن کے تعلق کو ایک بالکل نئے انداز میں پیش کیا ہے جس کی اس مقالے میں وضاحت کی گئی ہے۔

اقبال نے اپنے افکار میں جن معاشی مسائل پر نسبتاً زیادہ توجہ دی ہے ان میں افلاس و جہالت سے نجات اور معاشی ترقی کا حصول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے علم معاشیات کی کتب میں ان مسائل پر کسی مربوط انداز میں بحث نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی نظریئے یا فارمولے مرتب کئے گئے۔ دوسری جنگ عظیم نے یورپی استعمار پرست طاقتوں کو کمزور کر دیا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی بے شمار ایشیائی اور افریقی ممالک آزاد ہو گئے اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ اب ان ممالک کے کروڑوں غریب عوام معاشی طور پر خوشحال ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ معلوم ہوا کہ معاشی ترقی کے راستے میں کئی رکاوٹیں ہیں۔ مثلاً وسائل اور سرمائے کی کمی' آبادی کا دباؤ' ہنرمندی اور علوم و فنون کا فقدان اور صنعتی پسماندگی۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے بھرپور اقدامات کرنے پڑیں گے۔ ماہرین اقتصادیات بھی مجبور ہو گئے کہ روایتی معاشی نظریات سے ہٹ کر غربت و افلاس پر قابو پانے کیلئے نیا انداز فکر اختیار کریں۔ یہی وہ پس منظر تھا جس نے علم معاشیات کی ایک نئی شاخ کو جنم دیا جسے ترقیاتی معاشیات کہتے ہیں۔

اگر بنیادی معاشی اصولوں کا ڈھانچہ برقرار رہا لیکن ترقیاتی معاشیات نے اس کے اوپر نظری خیالات اور عملی تجاویز کی ایک الگ عمارت تعمیر کی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ترقیاتی معاشیات پر بے شمار کتابیں' رپورٹیں اور تجزیاتی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور سب کے موضوعات یہی ہیں کہ غربت کو کیسے دور کیا جائے' آمدنیاں کیسے بڑھائی جائیں' پیداوار میں کیسے اضافہ ہو اور انسان کی زندگی کا معیار کیسے اونچا کیا جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال کے سامنے بھی یہی مسائل تھے اور ان کی عملی تجاویز کا رخ انہی مسائل کو حل کرنے کی طرف تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ترقیاتی معاشیات کے مباحث کا دائرہ بہت وسیع اور مربوط ہے اور اقبال کے دور کا علم معاشیات اس معاملے میں تنگ داماں تھا۔

آج کا پاکستان

علامہ اقبال کے معاشی افکار و تجاویز کی روشنی میں اگر ہم آج کے پاکستان پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہم نے ان انقلابی خطوط پر اپنا معاشرہ اور اقتصادی ڈھانچہ تعمیر نہیں کیا جس کی نشاندہی انہوں نے کی تھی۔ نہ ہی صحیح معنوں میں زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں اور نہ ہی دیہی علاقوں کی ٹھوس اصلاح و ترقی کیلئے نتیجہ خیز کام کیا ہے۔ صنعتی اور تجارتی تعلیم تو کجا ابھی قوم کو پوری طرح تعلیم یافتہ بھی نہیں بنایا جا سکا۔ ۲۵ فیصد سے زائد لوگ ابھی تک شدید ترین غربت کا شکار ہیں جنہیں ماہرین معاشیات خط غربت سے نیچے بسنے والے لوگ کہتے ہیں۔ معاشی ناہمواریاں عروج پر ہیں۔ مفاد پرستی اور رشوت ستانی زوروں پر ہے۔ ہمارا ملی شعور خوابیدہ ہے اور ذات انسان کی حفاظت اور پرورش کا جو خواب حکیم الامت نے دیکھا تھا وہ ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ مجموعی صورت حال یہ ہے کہ

تیرے امیر مال مست' تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی' خواجہ بلند بام ابھی !

منتخب کتابیات

اردو

۱- شیخ محمد اقبال
(i) علم الاقتصاد' اقبال اکادمی' لاہور-
(ii) کلیات اردو' اقبال اکادمی' لاہور-
(iii) کلیات فارسی' اقبال اکادمی' لاہور-
(iv) قومی زندگی اور ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر- آئینہ ادب' لاہور' ۱۹۷۰ء

۲- شیخ عطاء اللہ - اقبال نامہ' شیخ محمد اشرف تاجر کتب- لاہور ۱۹۹۱ء

۳- ڈاکٹر سید محمد عبداللہ "مسائل اقبال" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' لاہور' ۱۹۷۳ء- (باب ۱۸- "کیا اقبال اشتراکی تھے")

۴- ڈاکٹر معین الدین عقیل "اقبال اور جدید دنیائے اسلام" مکتبہ تعمیر انسانیت' لاہور- ۱۹۸۶ء (باب دو از دہم "اشتراکیت کا مسئلہ")

۵- بیدار ملک "اقبال شناسی اور کرینٹ" بزم اقبال' لاہور ۱۹۸۸ء-(Dr. Taseer "Iqbal and Modern Problems.")

۶- ڈاکٹر صدیق جاوید- "علم الاقتصاد- ایک عمرانی مطالعہ" اقبال' بزم اقبال کا سہ ماہی مجلہ- اکتوبر ۱۹۸۹ء' صفحہ ۸۱-۹۷

۷- محمد حنیف رائے مرتب- اقبال اور سوشلزم- البیان' لاہور' ۱۹۷۰ء

۸- محمد حنیف شاہد- اقبال اور پنجاب کونسل- مکتبہ زریں' لاہور- ۱۹۷۷ء

انگریزی

9- Mohammad Safdar Mir (Zen), Iqbal, The Progressive, Book Traders Lahore, 1990 (chapter 17, Letters of Iqbal to Jinnah: Chapter 16 "Islam is a Socialist Religion").

10. A.A.Siddiqi, "Iqbal and Marxism" (Asloob Ahmad Awan, Iqbal, Essays and Studies, Ghalib Academy, New Delhi, 1978, pp.285-305)

11- Shamloo, Speeches and Statements of Iqbal, Almanan Academy, Lahore, 1948.

12- Letters of Iqbal to Jinnah, M.M.Ashraf, Lahore, 1942.

13- Dr.Javed Iqbal, Iqbal: Was He A Socialist, Lahore.

14- Dr.Mohammad Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy, Lahore, 1989.

15- UNDP, Human Development Report, 1994, Oxford University Press, Delhi, 1994, p.63.

16- Irma Adelman, A Model of Economic Growth, New York.

17- Shamsual Hasan, "Economic Blueprint of Pakistan Movement" Pakistan Banker, a magazine of the Bank of Punjab, January-June, 1993, p.84.

18- Alexander Grey, The Development of Economic Doctrine, Longmans, Green And Co, London. (See Epilogue).

19- Rafique Ahmad, "The Origin of Economic and the Arabs", Pakistanb Economic Journal, April 1953.

اگر بنیادی معاشی اصولوں کا ڈھانچہ برقرار رہا لیکن ترقیاتی معاشیات نے اس کے اوپر نظری خیالات اور عملی تجاویز کی ایک الگ عمارت تعمیر کی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ترقیاتی معاشیات پر بے شمار کتابیں' رپورٹیں اور تجزیاتی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور سب کے موضوعات یہی ہیں کہ غربت کو کیسے دور کیا جائے' آمدنیاں کیسے بڑھائی جائیں' پیداوار میں کیسے اضافہ ہو اور انسان کی زندگی کا معیار کیسے اونچا کیا جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال کے سامنے بھی یہی مسائل تھے اور ان کی عملی تجاویز کا رخ انہی مسائل کو حل کرنے کی طرف تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ترقیاتی معاشیات کے مباحث کا دائرہ بہت وسیع اور مربوط ہے اور اقبال کے دور کا علم معاشیات اس معاملے میں تنگ داماں تھا۔

آج کا پاکستان

علامہ اقبال کے معاشی افکار و تجاویز کی روشنی میں اگر ہم آج کے پاکستان پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ ہم نے ان انقلابی خطوط پر اپنا معاشرہ اور اقتصادی ڈھانچہ تعمیر نہیں کیا جس کی نشاندہی انہوں نے کی تھی۔ نہ ہی صحیح معنوں میں زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں اور نہ ہی دیہی علاقوں کی ٹھوس اصلاح و ترقی کیلئے نتیجہ خیز کام کیا ہے۔ صنعتی اور تجارتی تعلیم تو کجا ابھی قوم کو پوری طرح تعلیم یافتہ بھی نہیں بنایا جا سکا۔ ۲۵ فیصد سے زائد لوگ ابھی تک شدید ترین غربت کا شکار ہیں جنہیں ماہرین معاشیات خط غربت سے نیچے بسنے والے لوگ کہتے ہیں۔ معاشی ناہمواریاں عروج پر ہیں۔ مفاد پرستی اور رشوت ستانی زوروں پر ہے۔ ہمارا ملی شعور خوابیدہ ہے اور ذات انسان کی حفاظت اور پرورش کا جو خواب حکیم الامت نے دیکھا تھا وہ ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔ مجموعی صورت حال یہ ہے کہ

تیرے امیر مال مست' تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی' خواجہ بلند بام ابھی !